Date of Publication : 02-12-2014 PRICE Rs. 3/-

POSTED AT N.D.P.S.O, New Delhi-01
ON 03-04 Dec. 2014 R.N.I No. 2186/57
POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without PrepaymentU (C) 160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

8-14 December 2014
Issue: 46, Vol.: 73

۸ تا ۱۴ دسمبر ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۴۶، جلد نمبر: ۷۳

دسمبر 2014 کے ساتھ اردو زبان و ادب کی دو عظیم ہستیوں کی صد سالہ برسی کا ہنگامہ بھی رخصت ہوا چاہتا ہے۔ صد سالہ برسی کے اس الوداعیہ مضمون میں ہم نے ان زعمائے ادب کی خوش مذاقی اور ظرافت پسندی کی 'بشری' نظیریں خود ان کی زندگی کے سوانحی مواد اور ان کی نثری تحریروں سے چن کر جمع کر دی ہیں۔ اگر کچھ مثالیں یہاں دہرائی بھی گئی ہیں تو محض اس لیے کہ وہ اپنی لطافت و شائستگی کے لحاظ سے قند مکرر کا مزہ رکھتی ہیں۔

مولانا شبلی کی سوانح حیات اور تحریروں کے مطالعے سے اُن کی ایک زندہ دل اور شگفتہ مزاج شخصیت کا تصور اُبھرتا ہے اور یہ اتنا قوی ہے کہ یہاں اس پہلو کو تفصیل سے متعارف کرانے کی ضرورت نہیں، البتہ بعض 'حالی شناسوں'

'مزاح' کے سلسلے میں حالی کے نقطۂ نظر کی بخوبی ترجمانی کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے مقالے کی تمہید میں لکھا ہے کہ 'مزاح' ایک جبلی خاصیت ہے جو کم و بیش ہر انسان میں پائی جاتی ہے۔ مزاح کا مقصد 'خوش کرنا' ہونا چاہیے اور اس لیے ضروری ہے کہ وہ دل خوش کن ہو، بہ مثل 'ایک ٹھنڈی ہوا کے جھونکے' اور 'ایک سہانی خوشبو کی لپٹ' کے 'پژمردہ دل باغ باغ کرنے والا'۔ ایسا مزاح فلاسفہ، حکما، اولیا اور انبیا نے بھی کیا ہے اور یہی مزاح کسی کو لوگوں میں محبوب و مقبول بناتا ہے۔

اسی کے ساتھ انھوں نے خبردار بھی کیا ہے کہ 'مزاح' کا حد سے تجاوز کرنا مسخرہ پن ہوگا جو مزاح کو استہزا، پھکڑپن، فحش اور دشنام میں بدل دیتا ہے اور وہ

پہلی قسط

حالی اور شبلی کی خوش ذوقی اور ظرافت پسندی

اسیم کاویانی (فلیٹ نمبر 702، کیپٹن اپارٹمنٹ، بیلویڈرے روڈ، مجگاؤں، ممبئی-400010)
E-mail: aseemkavyani@gmail.com

نے اُن کی شبیہ قوم کے نوحہ گر کی سی بنا کر رکھ دی جب کہ وہ اتنے روکھے پھیکے بھی نہیں تھے اور انھیں بھی لٹریری زبان میں

ع کم کم ہی سہی نسبت پسندی ہے

پھر خاندانی اثر اور پرورش کا فرق بھی ذہن میں رکھیے۔ شبلی ایک آسودہ حال اور زمیں دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور حالی ایک غریب خاندان کے فرد تھے۔ شبلی 1857 میں پیدا ہوئے تھے جو غدر کا سال ہے۔ حالی کی عمر اُس وقت بیس سال تھی اور وہ اُس وقت غدر کے مصائب کو جھیل رہے تھے۔

خوش قسمتی سے حالی کو غالب اور سرسید دونوں ہی کی صحبت نصیب ہوئی تھی۔ غالب اگر حیوان ظریف تھے تو سرسید بھی کچھ کم ظریف الطبع نہیں تھے۔ اُن دونوں ہی شخصیتوں نے یقیناً حالی کی فکر و نظر میں کشادگی پیدا کی تھی۔ دوسری طرف سرسید کی صحبت نے بقول شیخ شبلی کے دینی عقائد میں بھی جلا پیدا کی۔

مقالاتِ حالی میں ہمیں ایک مقالہ 'مزاح' پر بھی ملتا ہے۔ 1879 میں 'تہذیب الاخلاق' میں شائع ہوا یہ مقالہ

بجائے خوبی کے عیب بن جاتا ہے۔ ہماری قوم میں اڈیٹر اپنے اخبار کی گرم بازاری کے لیے، سخن ور اپنی شاعری چمکانے کے لیے، واعظ اپنی مجلسوں میں جوش بڑھانے کے لیے اور امرا اپنی محفلوں میں رنگ بھرنے کے لیے کہیں کہیں ظرافت کی انتہائی ادنا سطح پر نظر آتے ہیں۔

بہرکیف حالی و شبلی دونوں ہی نے مدرسوں کی تبلیغ و تسبیح کی مذہبی فضا میں تعلیم پائی تھی، اس لیے عربی ادب کی مشاطگی کے ساتھ ساتھ دین و ملت کی غم خواری کے کلاوے ان کے لیے زیب و امتیاز و افتخار ثابت ہونے بھی اُن کا لازمۂ حیات ٹھہرا تھا۔ اب ہمیں اُن سے دوسرے خندہ فروشوں کی سی ہنسی ٹھٹول کی توقع تو رکھنی نہیں چاہیے۔ ان زعمائے ادب کے یہاں ظرافت کا عنصر مطائبات اور شگفتگی بیان کی حد سے آگے نہیں بڑھتا۔ ظاہر ہے:

ع عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے

مولانا حالی نے اپنی ایک تحریر (مذہبیان تہذیب کی بد اقبالیاں) کے ضمن میں Free Trade کا ذکر کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ متمدن قومیں جن حکمتوں اور تدبیروں اور جائز و ناجائز طریقوں سے دنیا کی دولت کھسوٹتی جاری ہیں، اس میں اور اگلے زمانے کی لوٹ کھسوٹ میں کوئی خاص فرق نہیں رہ گیا ہے۔ اس کی مثال میں انھوں نے ایک نہایت حاذق طبیب اور محمد شاہ کے معالج حکیم علوی خاں کا یہ دل چسپ قصہ بیان کیا ہے کہ اُن کے زمانے میں ایک عطار بھی اُن کے نسخے دیکھتے دیکھتے علاج کرنے لگا تھا۔ لوگوں نے اُس کے بارے میں علوی خاں کو بتایا اور کہا کہ جس قدر مریض آپ کے علاج سے اچھے ہوتے یا مرتے ہیں، اسی کے قریب اُس کے علاج سے بھی اچھے ہوتے یا مرتے ہیں۔ علوی خاں نے انھیں جواب دیا: ''بلے! لاکن من بقاعدہ می کشم و آں قرم ساق بے قاعدہ می کشد'' (ہاں لیکن میں (اصولِ طب کے) قاعدے سے مارتا ہوں اور وہ قرم ساق بے قاعدہ مارتا ہے۔)

اب اس قصے کو ایک طرف رکھ دیں تو بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ خود حالی اپنی ساری زندگی 'از قاعدہ نہ باید گذشت' پر کاربند رہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کی چند منتخب نیکیوں، چند قدروں اور چند اصولوں کے دائرے سے باہر قدم رکھنا کبھی گوارا نہیں کیا۔ اردو شاعری کی اصلاح کرنے کے اپنے پیغام کو عام کرنے کا بیڑہ اٹھایا تو اپنے کلاسیکیت سے رچے بسے طرزِ سخن کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اُن کے برعکس شبلی کے یہاں مفاہمت بھی ہے اور لچک بھی۔ یہاں تک کہ تضاد سے بھی تعلق نبھانے کا ظرف موجود ہے۔ چودھری نظیر الحسن رضوی (صاحب 'المیزان') حضرت امام حسن کے حالات مبارک لکھ رہے تھے۔ شبلی نے انھیں خط میں تحریر کیا:

''... آپ حضرت امام حسن کے حالات مبارک لکھ رہے ہیں۔ بہتر اور باعث اجر ہے۔ لیکن پہلے جناب امیر کا درجہ تھا۔ اکثر اہل سنت اُن کے بہت سے فضائل سے بے خبر ہیں۔ میں حضرت عمر کے بارے میں سنی اور حضرت امیر کے بارے میں شیعہ ہوں۔''

1892 میں سرسید کے دورۂ حیدرآباد کے وفد میں حالی اور شبلی شامل تھے۔ وہاں ایک مشاعرے میں جب داغ نے اپنی منتخب غزل:

ادھر لا ہاتھ، مٹھی کھول، یہ چوری یہیں نکلی

اپنے ہنگامہ خیز انداز میں شروع کی تو حاضرین بے خود ہو گئے۔ شبلی نے حالی کو مشورہ دیا کہ 'وہ محفل کا رنگ دیکھ کر اپنی کوئی قدیم چیز سنائیں، یہاں نئی شاعری کا موقع نہیں'۔ حالی نے انھیں انکار کرتے ہوئے جواب دیا کہ 'از قاعدہ نہ باید گذشت' اور اپنی نئے طرز کی غزل پڑھی تھی:

ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا ہے رعب جمال تیرا

اور سچ تو یہ ہے کہ حالی کی اس غزل نے رنگ جما دیا تھا۔

مولانا حالی کی نواسی اور اردو کی مشہور مصنفہ صالحہ عابد حسین نے مولانا

حالی کے ایک منہ چڑھے ملازم عطاء اللہ کا ذکر کیا ہے۔ نہ صرف مولانا نے اُسے مدت العمر تک جھیلا تھا بلکہ اُن کے انتقال کے بعد وہ جب تک جیتا رہا تھا، خواجہ سجاد حسین (فرزند حالی) سے متوسل رہا تھا۔ وہ اتنا اونچا سنتا تھا کہ اُسے کچھ کہنے کے لیے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنا پڑتا تھا۔ ایک ٹانگ بیکار تھی، ہاتھوں میں لنگ تھا۔ بدمزاج اور غصیلی اتنا کہ خدا کی پناہ۔ کوئی کام ڈھنگ سے نہ کر پاتا تھا، اس پر بھی کبھی اپنی خطا یا نااہلی کو تسلیم نہ کرتا تھا۔ شاید اُس کے ان ہی نقائص کی وجہ سے حالی اُس کے ساتھ خاص ہمدردی اور محبت سے پیش آتے تھے اور کبھی نہ ڈانٹتے تھے۔ مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی نے برسوں تک عطاء اللہ کے کردار اور مولانا حالی کے سلوک کا مشاہدہ کیا تھا۔ ایک مرتبہ کہنے لگے: "اگر علاوہ اور خوبیوں کے عطاء اللہ اندھا بھی ہوتا تو مولانا کے نقطۂ نظر سے اُس میں ایک اور خوبی کا اضافہ ہو جاتا۔" گویا وہ ہمہ صفت موصوف ہوتا۔

شبلی ایسی فرشتگی کے حامل نہیں تھے، لیکن دل آسائی کے جذبے سے محروم بھی نہ تھے۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران ایک بار انھیں کشمیر جانے کی سوجھی۔ ان کی خواہش تھی کہ مولوی سمیع کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ انھیں لکھا کہ سفر خرچ تمھارے ذمے، باقی اقامت کا خرچ میرے ذمے۔ علاوہ میری ہمرہی وہمدردی کے، کشمیر کا دیکھنا کچھ کم نہیں۔ یہاں نہ دیکھا تو قیامت میں اگرچہ اس کا نمونہ دیکھنے میں آئے گا، مگر اصل و نقل میں پھر فرق ہے۔ کشمیر جانے سے ممکن ہے تمھارے ظاہری رنگ میں فرق آجائے۔ یعنی سلواں مشستن از زنگی سیاہی غلط ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ مولوی سمیع کا رنگ خاصا سیاہ تھا۔

اس خط سے ظاہر ہے کہ شبلی اگرچہ آخرت اور اُس کی نعمتوں کے قائل تھے، لیکن انھیں دنیوی جنت سے بھی انکار نہ تھا۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی قائل تھے، بالخصوص جب کوئی جنت نگاہ ہمدم بھی ہو۔ ایک خط میں مولانا حبیب الرحمن شروانی کو بمبئی کی رنگین صحبتوں کا ذکر کرتے ہوئے اُن کا قلم یوں کیف بار ہوتا ہے: "... بہشت سے آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ افسوس آپ ایمان بالغیب کو ایمان بالحضور پر ترجیح دیتے ہیں۔" شبلی اگر شبلی نہ ہوتے تو تسنیم رہتے اور تب بھی جنت کا ساتھ نہ چھوڑتے۔

حالی اگر حالی نہ ہوتے تو خستہ ہوتے، تب نہ جانے اُن کا کیا حال ہوتا اور تب شاید اُن کی خستگی کی داد دینا بھی محال ہوتا۔ اچھا ہوا کہ وہ حالی ہو گئے اور شاید اسی باعث اب تک اردو ادب کی تاریخ میں ان کا سکّہ رواں ہے۔ جب علی گڑھ کالج کے ڈیپوٹیشن میں سرسید کے ساتھ وہ حیدرآباد گئے تھے، وہاں سروقارالامرا منصب وزارت پر فائز تھے۔ انھوں نے حالی کے -/75 روپوں کے وظیفے میں اضافہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ سکّۂ حالی کے مطابق آپ کی رقم وظیفہ میں پچیس روپوں کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ پھر مسکرا کر فرمایا کہ سکّۂ حالی کے معنی مجھے آج ہی معلوم ہوئے۔ حالی نے جواب دیا: 'مجھے بھی اپنے تخلّص کی قدر و قیمت کا آج احساس ہوا کہ اب یہ ٹکسالی ہو گیا ہے۔'

اپنے اس تخلّص پر تو حالی نے ایک دیہقان کی بیداد کو بھی داد کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ جب وہ ایک بار سہارن پور میں ایک معزز رئیس اور زمیندار کے یہاں آئے ہوئے تھے اور محو استراحت تھے۔ وہاں ایک کسان چلا آیا۔ رئیس نے اُسے حکم دیا کہ 'یہ بزرگ آرام کر رہے ہیں، ان کو پنکھا جھل'۔ وہ بے چارہ پنکھا جھلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے چپکے سے رئیس سے پوچھا کہ 'یہ بزرگ کون ہیں؟ میں نے ان کو پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔' رئیس نے جواب دیا: 'کم بخت تو ان کو نہیں جانتا! سارے ہندستان میں ان کا شہرہ ہے۔ یہ مولانا حالی ہیں۔' یہ سن کر غریب کسان نے بڑے تعجب سے کہا کہ 'کبھی ہالی (ہل چلانے والا) بھی مولبی ہوئے ہیں!' مولانا حالی آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔ یہ فقرہ سن کر پھڑک اُٹھے اور رئیس سے فرمایا: "حضرت! اس شخص کی آج داد دلی ہے۔"

بیگم صالحہ عابد حسین جب مولانا حالی کی سوانح 'یادگارِ حالی' لکھ رہی تھیں تو انھوں نے اُن کے حالات کی جستجو میں مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی رجوع کیا۔ مولانا آزاد نے انھیں مولانا حالی کے تعلق سے چند دلچسپ واقعات تحریر کر دیے تھے، جو 'یادگارِ حالی' کے آغاز میں 'عطیۂ ابوالکلام آزاد' کے طور پر شامل ہیں۔

مولانا آزاد نے ذکر کیا ہے کہ سرسید کے مذہبی نظریات میں اُن کا یہ موقف معلوم و معروف ہے کہ دینی تعلیم کو قانونِ فطرت کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔ اسی بنا پر انھیں طنزاً 'نیچر' اور اُن کے مقلدوں کو 'نیچری' کہا جانے لگا تھا۔ شبلی خود کو ان کے مقلدوں سے الگ رکھتے تھے۔ جس زمانے میں سرسید سورہ اسریٰ کی تفسیر لکھ رہے تھے، ایک موقع پر مولانا حالی بھی موجود تھے اور مولانا شبلی بھی۔ واقعۂ اسریٰ کی بحث میں حضرت عائشہ کے اس مسلک کا ذکر آیا کہ وہ حضور کے معراجِ جسمانی کی قائل نہ تھیں۔ سرسید نے بھی یہی مسلک اختیار کیا تھا۔ مولانا شبلی ازرہِ ظرافت بول اٹھے کہ 'معلوم ہوتا ہے، حضرت عائشہ بھی نیچری تھیں، ورنہ معراجِ جسمانی سے انکار کیوں کرتیں؟' یہ سنتے ہی مولانا حالی نے کہا: "اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نیچری ہونا بڑی ہی فضیلت کی بات ہے کہ حضرت عائشہ تک اس زمرے میں داخل ہیں، لیکن مولانا کل تک تو آپ بڑے اصرار سے کہہ رہے تھے کہ میں نیچری نہیں ہوں۔ اچھا، اب معلوم ہوا، یہ آپ کا انکسار تھا!"

سرسید کی تعلیمی تحریک اور اُن کے نظریات سے وابستہ ہونے کے بعد مولانا حالی نے سرسید کے رفقا اور متبعین میں سب سے موثر اور فعال کردار ادا کیا تھا۔ اسی وابستگی کے دور میں جو کہ آخر دم تک رہی، اُن کے دو انتہائی اہم اور نمایاں کارنامے 'مسدسِ حالی' 1879 میں اور 'مقدمۂ شعر و شاعری' 1893 میں منصۂ شہود پر آئے۔ مسدس میں انھوں نے مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان رقم کی ہے اور خاص طور پر اُن کے اُن معائب کو بیان کیا ہے جو اُن کی زار و زبوں حالت کا سبب بنے اور مقدمے میں انھوں نے روایتی اردو شاعری کے تقریباً کل دفتر کو رد کرتے ہوئے مقصدی، تعمیری اور حقیقی ادب کا ایک بالکل نیا پیغام دیا ہے۔ ان دونوں ہی کتابوں نے ہماری ادبی تاریخ میں روایت پسندوں اور لکیر کے فقیروں کی طرف سے سب سے زیادہ جارحانہ مخالفت کا سامنا کیا تھا اور پھر حالی کا حامیِ سرسید ہونا بھی ایک ناقابلِ معافی جرم تھا۔ نتیجتاً اُن کی مخالفت میں جہاں خاکی، خیالی، ذوقی، سواؔلی اور عوامی جیسے تخلصوں سے لیس ہرزہ گویوں کا غول کا غول سب و شتم کے تیر چلانے میں مسلسل مصروف تھا، وہیں کچھ ثقہ حضرات بھی شامل تھے۔ 'بہار پنچ'، 'سفیر قیصر'، 'مشرق'، اور 'ریاض الاخبار' نے اپنے اپنے محاذ قائم کر لیے تھے، لیکن اصل میدانِ کارزار 'اودھ پنچ' نے گرم کر رکھا تھا۔ 'اودھ پنچ' کے قلمی جرنیلوں میں اکبر الٰہ آبادی اور ابو الجبر تو دسوی بھی شامل تھے۔ 1904 میں ابو الجبر دسوی نے ایک فکاہیہ 'التماس' لکھا تھا اور نیچری لفظوں کی ایک فرہنگ بھی مرتب کی تھی۔ 'اودھ پنچ' نے اس نوٹ کے ساتھ کہ 'عروسِ نیچریت کا حسن جہاں سوز تھا۔ نیچری کانفرنس کی آرائش دشمنِ ایمان و آگہی تھی۔ پیر نیچر کا وعظ رہزنِ تمکین و ہوش تھا۔ نیچری احباب، نیچری تہذیب، نیچری شاعری سب کفر بہ ساماں تھی؛ نیچری فرہنگ کا نمونہ شائع کیا تھا۔ آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

نیچرل شاعر و شاعری: وہ جو عروض سے نابلد، قوافی سے انجان ہو، مگر لن ترانی کے میدان میں شیخی زبان اور ایجاد گندہ پر نازاں۔

نیچرل نگاری: وہ جس کی بناوٹ حسن فروشوں کی کشش رکھتی ہو۔ تھیٹ ہندی کی بھرمار اور غیر مانوس لفظوں کا طومار ہو۔

نیچرل ترجمہ: ... دیہاتی جنات اور وحشی شیاطین کی بولیاں۔ اجنبی زبانیں، مہمل تاویلیں اور اس پر ہم چو من دیگرے نیست کی احمقانہ صدائیں۔

نیچرل تعلیم: الحاد و دہریت کی تربیت، خدا کے وجود سے انکار، پیغمبری سے بے خبری۔

نیچرل ترقی: مال مفت کی تلاش... ریفارمری کا ادّعا، جدت کا قربتہ۔ اجتہاد کا شگوفہ۔ ریفارمیشن قائم کرنے کا ولولہ۔

نیچرل ملّا: نے دروں نے بروں۔ نہ نیچرم نہ مسلماں۔ نہ صنم نہ بجو وہ یعنی معجونِ مرکب۔

نیچرل شمس العلما: لکھے نہ پڑھے نام ملا فاضل۔ چار پائے برو کتابے چند

('اودھ پنچ' 29 دسمبر 1904، منقول از 'حالی بہ حیثیت شاعر')

مولانا حالی نے بہت کم کسی کے جواب میں قلم اٹھایا۔ اُن کے 1906 میں لکھے ایک مکتوب میں اُن کے ایک نامکمل فارسی 'التماس' کا ذکر ملتا ہے۔ اگر وہ دسوی کے التماس اور فرہنگ کے جواب میں نہ بھی لکھا گیا ہو تب بھی وہ دونوں تحریریں اُن کے پیشِ نظر ضرور رہی ہوں گی۔ مولانا کے طنز کی کاٹ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے اور آج کے حالات میں بھی کافی حد تک بامعنی نظر آتی ہے:

المذہب: اعلانِ جنگ
الدین: تقلیدِ آبا و اجداد
المولوی: آں کہ جمیع مسلماناں را از دائرۂ اسلام خارج می کند۔
الواعظ: آں کہ در تفریق بین المسلمین خطا نہ کند۔
الانجمن ہائے اسلامیہ: ستیزہ و جنگ و جدال۔
الامیر: آں کہ تہی دست و قرض دار باشد۔
الرئیس: آں کہ از ریاست بے خبر باشد۔
الیونیورسٹی: کارخانۂ کلرک سازی۔
الامتحان: آزمائش لیاقتِ ممتحناں۔
الکیمیٹی: بہ مصیبت ہائے فیصلہ یک طریقہ
العلی گڑھ: پارٹی عہد و فا۔

مولانا شبلی نے بھی اپنی کئی کتابوں کے سلسلے میں علمی و ادبی محاذ آرائی کا سامنا کیا تھا۔ ان کی ایک 'موازنۂ انیس و دبیر' کے خلاف کئی کتابیں لکھی گئیں اور یہ بات ثابت کی گئی کہ انھوں نے دبیر پر انیس کی فوقیت ثابت کرنے کے لیے کئی مقامات پر حد سے تجاوز کیا ہے، لیکن آخر میں ادبی دنیا نے تسلیم کر لیا کہ ان کا نقطۂ نظر غلط نہیں تھا اور انیس، دبیر پر فائق ہیں۔ 'موازنہ...' میں انھوں نے دبیر شکنی میں جابجا طنز کے وار کیے ہیں۔ ایک مقام پر ان کے بے محابا طنز نے دبیر کے ایک بند کے مندرجہ ذیل شعر کی جو درگت بنائی ہے، اُس کا یہاں دہرانا لطف سے خالی نہ ہوگا:

"شہرہ ہے یہ تا یہ جن و ملک سے
مضمون مرا گھر پوچھتے آتے ہیں فلک سے

شہرہ بھی اچھا کا ہے اور مضمون کو گھر پوچھنے کی بھی ضرورت ہے۔ شاید یہ مراد ہو کہ صرف نام مشہور ہو چکا ہے، لیکن چونکہ مضامین کو کبھی مرزا صاحب سے روشناسی نہیں ہوئی اور آستانہ مبارک تک پہنچنے کی نوبت نہیں آئی، اس لیے گھر کا پتا پوچھنا پڑا۔"

ہمارے یہ ذی احترام بزرگ بھی اپنی تصنیفات پر اپنے قدردان اور ادب شناس معاصرین کی رایوں اور تبصروں کے آرزومند رہا کرتے تھے، لیکن آج کل کے ادیبوں کی اپنی مدح و تحسین کی حریصی سے وہ بہت دور تھے۔ ذرا اُن کے اعتدالِ طرف اور منکسر مزاج کو ملاحظہ

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

دوسری اور آخری قسط

ہندستانی زبان کا مسئلہ

سہیل عظیم آبادی

ہم ہندستانی سیاسی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن ذہنی طور پر اب بھی روایتوں کے غلام ہیں۔ یہ گرہ اب تک ڈھیلی نہیں ہوئی بلکہ لگاتار جھٹکوں کی وجہ سے اور بھی سخت ہو گئی ہے۔ اول تو ہم کسی مسئلے پر آزادی کے ساتھ سوچ کر نتیجے پر پہنچنے کے عادی نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ کچھ مفروضے اور مسئلے اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں، اس کے بعد آزاد خیالی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے ہمارا سوچنا اقلیدس کا مسئلہ ثابت کرنے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ دماغ کا سارا زور ایک مفروضے کو ثابت کرنے میں ختم ہو جاتا ہے اور کسی صحیح نتیجے پر پہنچتے نہیں لیکن دل میں ضرور سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسی دلیلیں پیش کر دی ہیں جو ہمالہ سے بھی زیادہ وزنی ہیں۔

زبان کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہو رہا ہے، ہندی اور اردو کے حامی رسہ کشی کر رہے ہیں اور ایک کھینچ تان جاری ہے۔ اسی کھینچ تان کو ختم کرنے کے لیے ہماری قومی سبھا انڈین نیشنل کانگریس نے مہاتما گاندھی کی زبان سے ہندستان کی قومی زبان کا نام 'ہندستانی' رکھوایا۔ تو اب یہ کوشش ہے کہ ہندی یا اردو کو ہی ہندستانی مان لیا جائے اور اس طرح وہ کھینچ تان اب بھی باقی ہے جس کا اندازہ ملک کے بڑے بڑے لوگوں کی تقریروں، تحریروں اور اخباروں کے مضمونوں سے ہوتا ہے۔ دہلی والی تقریریں اس کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔

'ہندستانی' کے معاملے میں گاندھی جی نے کمزوری کا ثبوت دیا ہے۔ جہاں انھوں نے صلح کے خیال سے یہ نام رکھا تھا وہاں 'ہندستانی' کی شکل صورت کے متعلق بھی انھیں ایک صاف تخیل پیش کرنا چاہیے تھا۔ زبان کو آسان بنانے کی ضرورت کا احساس تو عام ہو چکا ہے اور یہ کام غیر محسوس طور پر برابر ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں منشی پریم چند کی کوششیں سب سے زیادہ کامیاب رہیں۔ انھوں نے غیر محسوس طور پر ہندی میں فارسی عربی کے سینکڑوں لفظ بھر دیے اور اردو میں ہندی کے۔ اور اس خوبی کے ساتھ کہ سب نے اس سے مزا پایا۔ لیکن 'ہندستانی' کی اسکیم کے اعلان میں گڑبڑپن پیدا ہو گیا اور یہ صرف اس لیے کہ اسکیم ناکام اور احساسات بیدار کا سامنا ہوا۔ لیکن اس میں گاندھی جی کا بھی کوئی قصور نہیں۔ یہ ہماری تاریخی ہنگامہ آرائیوں کا لازمی نتیجہ اور عکس ہے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ گاندھی جی کے پاس شاید خود بھی 'ہندستانی' کا کوئی مستقل اور صحیح تصور نہیں ہے، وہ خود ایک مدت تک ہندی ہندستانی، ہندی یعنی ہندستانی اور ہندستانی کی بھول بھلیوں میں چکر کاٹتے رہے ہیں اور اب جہاں جا کر رک گئے ہیں وہ ایک مبہم تخیل ہے، اور بس۔

مگر اس کی حقیقت سمجھنے کے لیے ہمیں گاندھی جی کے سیاسی رجحانات کا غور سے مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ ان کے پاس قومیت اور وطنیت کا ایک الجھا ہوا خیال ہے جس کا ایک سرا تو موجودہ زمانے کے رجحانات سے بندھا ہوا ہے اور دوسرا سرا ہندو کلچر اور اس کے احیا کے ساتھ۔ ان کی قومیت اور وطنیت، مذہبیت کی بنیاد پر قائم ہے جیسی کہ چند دوسرے ہندو بزرگوں کی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ دوسرے مذہب اور کلچر کو بھی پوری آزادی کے ساتھ زندہ دیکھنا چاہتے ہیں اور دوسرے نہیں۔ مسلمانوں میں گاندھی جی کی قسم کی قومیت اور وطنیت کے داعی اور پیامی جمیعت علمائے ہند کے بزرگان کہے جا سکتے ہیں۔

لیکن ہمیں اس کے لیے گاندھی جی پر کسی قسم کا الزام نہیں دھرنا چاہیے بلکہ سنجیدگی کے ساتھ ان تمام حالات پر غور کرنا چاہیے جن میں مہاتما جی نے زندگی بسر کی ہے۔ تاریخ ان کی پوری پوری سفارش ہی نہیں بلکہ حمایت کرتی ہے اور ہمیں یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ انھوں نے جو کچھ کیا ہے وہ ملک پر ان کا احسان ہے اور ان سے اس سے زیادہ کی امید رکھ کر مایوس ہونا خود ہماری غلطی ہے اور اگر ان کی بتائی ہوئی راہ ہمیں منزل تک نہیں پہنچا سکتی تو پھر ہمارا فرض ہے کہ اب دوسری راہ تلاش کریں۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں تاریخ کے ورقوں کو الٹنا ہوگا کیوں کہ یہ تاریخی الجھنوں کا نتیجہ ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندستان کی تاریخ میں ایک نئی جھلک پیدا ہوئی۔ انگریزوں سے لڑنے جھگڑنے کے بعد ہندستانیوں نے انھیں اپنا سرپرست بنالیا اور انگریزوں نے انگریزی تعلیم کا پرچار کر کے بڑی بڑی نوکریوں کی جھلک دکھا کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ ساتھ ہی تعلیم کی مشنریوں کو اس خوبی کے ساتھ چلایا کہ نتیجہ انہی کے حق میں نکلا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دماغوں میں اس انگریزی تعلیم کے ذریعے زہر بھرنا شروع ہو گیا اور دونوں ایک دوسرے کو دشمن سمجھنے لگے، مگر جب عیسائی مشنریوں نے اپنا مذہب پھیلانا چاہا تو ہندو اور مسلمان دونوں ہی چونک گئے اور انگریزی زبان کے خلاف ہنگامہ شروع ہوا۔ مسلمان عالموں نے انگریزی پڑھنا ناجائز قرار دیا، ہندوؤں میں کیشب چندر سین، سوامی وویکانند اور سوامی دیانند پیدا ہوئے جنھوں نے مذہب کی حفاظت شروع کی اور انگریزوں کو اپنے لیے ایک خطرہ سمجھا۔ اس طرح ہندستان میں قومیت اور وطنیت کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی، اس وقت کانگریس اتنی طاقتور جماعت نہ تھی، پھر بھی اس نے دبی زبان سے حکومت کی بعض باتوں پر نکتہ چینی کی۔ اس سے انگریزوں کو خطرہ محسوس ہوا اور وہ ادھر ادھر سہارا ڈھونڈنے لگے۔

اس کے بعد ہی سرسید نے مسلمانوں میں ایک نئی تحریک شروع کی، مسلمانوں کو انگریزی پڑھنے کی ترغیب دلائی۔ مذہبی لوگوں نے اس کی سخت مخالفت کی، لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی اور سرسید کے مخالفوں کو شکست ہوئی۔ چناں چہ قومی رجحان کے ساتھ اپنے اپنے مذہب کی حفاظت کے خیال نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ اس کا اثر ہمیں اس وقت کے ادب میں ملتا ہے جہاں بنکم بابو کے ناولوں میں قومیت کا تخیل موجود ہے اور مسلمانوں کے خلاف نفرت و حقارت کا جذبہ جھلکتا ہے اور وہ ہندو قوم کو انگریزوں کے زیر سایہ ترقی دینا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف سرسید نے اسباب بغاوت ہند نامی کتاب لکھ کر مسلمانوں کو غدر کے الزاموں سے بری کرنے کی کوشش کی، ساتھ ہی اس خیال کی اشاعت کی کہ مسلمانوں کا فائدہ انگریزوں سے مل کر رہنے میں ہے۔ انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک کو بھی مسلمانوں کے لیے خطرناک سمجھا اور اس سے علاحدہ رہنے کی ہدایت کی، یہ ساری چیزیں وہ کیوں کرتے رہے یا کن مصلحتوں کی بنا پر کرتے رہے، اس کا اندازہ کرنا یا ان کی نیت واقعی کیا تھی آج اس کا کہنا مشکل ہے، لیکن خان بہادر ولایت حسین نے سرسید کی جو ڈائری شائع کی ہے اس سے اس پر بہت زیادہ روشنی پڑتی ہے، لیکن سردست یہ چیز ہماری بحث سے باہر ہے اس لیے یوں ہی چھوڑنا مناسب ہے۔

بہرحال اس وقت مذہبی جذبہ جاگ چکا تھا اور ہندو قومیت اور مسلمان قومیت کی بنا مضبوط ہو چکی تھی۔ ۲۲-۱۹۲۱ء تک سیاست میں گاندھی جی اور مولانا آزاد نے لوگوں کو بار بار مذہب کے نام ہی پر ابھارا بلکہ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کا سمجھوتہ بھی مسلمانوں کے مذہبی جذبے کا نتیجہ تھا۔

گاندھی جی نے ہندستان کو قومیت کا ایک الجھا ہوا تخیل دیا، ہندو اور مسلمان گلے مل کر ملاپ اور اتحاد کا راگ الاپنے لگے، لیکن اس اتحاد اور ملاپ کے بعد بھی کوئی صاف خیال ان کے سامنے نہ تھا، یہی وجہ تھی کہ اس اتحاد کے بعد ۲۱-۱۹۲۰ء میں جو تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت شروع ہوئی وہ محض جذباتی تھی، اس کی تہ میں نہ کوئی جچا تلا پروگرام اور خیال تھا اور نہ قومیت ہی کا کوئی صاف تصور تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریک جتنی تیزی سے شروع ہوئی تھی اتنی ہی تیزی سے ختم ہو گئی۔ 'مندر' میں جا کر اذان دینے والے اور 'مسجد' میں بیٹھ کر پوجا کرنے والے 'بھائی' بہت جلد آپس میں لڑ پڑے اور مذہب میں اتنی آزاد روی اختیار کر لینے والے لوگ چھوٹے چھوٹے مذہبی جھگڑے پیدا کر کے ایک دوسرے کا خون بہانے لگے۔ اس کے لیے تاویلیں چاہے جو کچھ پیش کی جائیں لیکن واقعہ یہی ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو البتہ پہلے لیڈر ہیں جنھوں نے سیاست کو مذہب سے الگ بنانے کی کوشش کی اور قومیت کا تصور، وطنیت کی بنا پر صاف اور سلجھے نظریے کے ساتھ پیش کیا۔

اسی لیے پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے بعد کے لوگوں میں زبان کے مسئلے میں وہ الجھن نہیں جو ان سے پہلے کے لیڈروں میں ہے کیوں کہ پہلے کے لیڈر مذہب اور کلچر کے قائل ہیں جس کا زبان سے بہت گہرا تعلق ہے، اس لیے گاندھی جی کے پاس اگر 'ہندستانی' کا کوئی صحیح تصور نہیں تو کوئی تعجب نہیں بلکہ یہی ہونا چاہیے تھا۔

بہرحال اب یہ حالات ہمارے سامنے ہیں جن میں ہمیں اپنے لیے راہ

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

اردو دُنیا

1995 کے بعد سے اردو اساتذہ کی تقرری کیوں نہیں کی گئی؟

ہائی کورٹ نے محکمہ تعلیم کی سرزنش کی، فیصلہ محفوظ

نئی دہلی (۲۹ نومبر)۔ اردو اساتذہ کی بحالی کے سلسلے میں آج ہائی کورٹ نے محکمہ تعلیم کی سرزنش کرتے ہوئے اپنا فیصلہ محفوظ کرلیا ہے۔ عدالت میں آج اس تعلق سے طویل بحث چلی۔ جہاں ایک طرف اساتذہ کی بحالی کے لیے دلائل پیش کیے گئے وہیں محکمہ تعلیم و دیگر پارٹیاں راہِ فرار اختیار کرتی نظر آئیں۔ امید کی جارہی ہے کہ عدالت کا فیصلہ اردو اساتذہ کی بحالی کے لیے تاریخ ساز ثابت ہوگا۔ ایڈوکیٹ مشتاق احمد نے بحث کے دوران عدالت کو بتایا کہ ۱۹۹۵ء کے بعد سے اب تک اردو میڈیم اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری نہیں ہوپائی ہے۔ عدالت نے محکمہ تعلیم کے وکیل سے پوچھا کہ آخر ۱۹۹۵ء کے بعد سے اردو اساتذہ کی بحالی کیوں نہیں کی گئی؟ اس پر محکمہ تعلیم کی جانب سے وکیل دی گئی کہ ہمارے پاس آر آر (ریکروٹمنٹ رولز) نہیں ہے، جس کی وجہ سے بھرتی نہیں ہوپائی۔ اس جواب پر ایڈوکیٹ مشتاق احمد نے عدالت میں وہ دستاویز پیش کی جس کی بنیاد پر بحالی ہوتی تھی اور کہا کہ پہلے بحالی کے لیے اردو اور انگریزی اخباروں میں اشتہار شائع ہوتا تھا۔ اس پر کورٹ نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اردو اساتذہ کی بحالی ہونی چاہیے، ساتھ ہی عدالت نے یہ بھی کہا کہ اردو اساتذہ بھی تو نہیں ملتے، جس پر ایڈوکیٹ مشتاق احمد نے کہا کہ یہ بات تو محکمہ تعلیم کہتا آرہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو اساتذہ بے شمار موجود ہیں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے 200 اساتذہ کی فہرست محکمہ کو سونپی تھی پھر بھی محکمہ نے تقرری نہیں کی۔ انھوں نے عدالت کو بتایا کہ ایکٹ کے مطابق جس اسکول میں اردو پڑھنے والے چھ طلبہ موجود ہوں تو وہاں اردو ٹیچر کا انتظام کیا جانا چاہیے۔ اس کے لیے ایک رجسٹر ہوتا ہے جس میں طلبہ یا والدین اپنی خواہش ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اردو پڑھانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کارپوریشن اور این ڈی ایم سی کے اسکولوں میں اردو اساتذہ کی بحالی تو ہوئی مگر ضرورت کے مطابق نہیں کی گئی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اسکولوں میں اردو اساتذہ کی نگرانی کے لیے انسپکٹر کا تقرر کیا جاتا ہے وہ بھی کئی سالوں سے نہیں کیا گیا۔ جن اسکولوں میں اردو ٹیچر نہیں ہیں وہاں ہندی کے ٹیچر سے کام چلایا جارہا ہے۔ انھیں ہٹا کر اردو ٹیچر مقرر کیے جائیں۔ اس پر فریق مخالفین محکمہ تعلیم، کارپوریشن، این ڈی ایم سی اور دہلی حکومت نے عدالت کو بتایا کہ ہم اردو اکادمی سے اردو ٹیچر لیتے ہیں۔ ایڈوکیٹ مشتاق احمد نے کہا کہ اردو اکادمی کون ہوتی ہے اردو ٹیچر دینے والی، یہ کام اکادمی کا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ اب تک گیسٹ اور کنٹریکٹ پر اساتذہ کا تقرر کیا جاتا رہا ہے جب کہ انھیں مستقل کیا جانا چاہیے۔ چیف جسٹس بی ڈی احمد اور جسٹس راجیو سہائے نے بھی فریقین کے دلائل سننے کے بعد اپنا فیصلہ محفوظ کرلیا۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو اساتذہ کے تقرر کا اعلان

نظام آباد، تلنگانہ (۱۸ نومبر)۔ آل انڈیا آئیڈیل ٹیچرس اسوسی ایشن نظام آباد کے ضلعی صدر جناب سید عبدالعلیم اور محمد اسحاق حسین صدر AITA نظام آباد ٹاؤن نے اپنے مشترکہ صحافتی بیان میں چیف منسٹر کے اسمبلی میں دیے گئے اس بیان کا خیرمقدم کیا جس میں چیف منسٹر نے کہا کہ بہت جلد اردو اساتذہ کا تقرر کیا جائے گا۔ مگر چیف منسٹر نے صرف اردو اساتذہ کی خالی اسامیوں پر تقرر کا تیقن دیا۔ انھوں نے چیف منسٹر سے مطالبہ کیا کہ ضلع نظام آباد کے 593 اساتذہ کی مطلوبہ اسامیوں کو منظور کرتے ہوئے انھیں DSC-2015 کے نوٹیفکیشن میں شامل کیا جائے۔ اردو میڈیم کے لیے خصوصی ڈی ایس سی منعقد کی جائے تب ہی اردو میڈیم اسکولوں میں اساتذہ کی قلت کو دور کیا جاسکتا ہے۔ نویں / دسویں جماعت کا نصاب تبدیل کردیا گیا ہے، اس نصاب کے تحت ہائی اسکولوں میں مضمون واری مستقل اساتذہ کی تقرری ضروری ہے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

اردو میڈیم اسکولوں میں اساتذہ کی خالی اسامیوں کو پُر کرنے کا مطالبہ

محبوب نگر، تلنگانہ (۱۰ نومبر)۔ مختلف تنظیموں اور انجمنوں کی بارہا نمائندگی کے باوجود ضلع محبوب نگر میں اردو میڈیم اسکولوں میں اساتذہ کی 165 خالی اسامیوں پر عدم تقرری اور اردو میڈیم اسکولوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے جانبدارانہ سلوک کے خلاف مسلم حقوق پوراٹا کمیٹی اور انڈین مسلم لیگ نے مشترکہ طور پر ایک روزہ بھوک ہڑتال کا اہتمام کیا۔ اس بھوک ہڑتال کیمپ میں دونوں تنظیموں کے قائدین کے علاوہ طلبہ کے سرپرستوں نے بھی حصہ لیا۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

تلنگانہ میں اردو کو سرکاری سطح پر فروغ دینے کی ضرورت

حیدرآباد (۲ نومبر)۔ موسٹ قار ایجوکیشن اینڈ اکنامک تلنگانہ نے تلنگانہ سرکار کی جانب سے پیش کیے گئے بجٹ پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اقلیتوں کی ترقی اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے عزائم کی ستائش کی۔ موسٹ کے عہدیداران سید امیر محمد، سید علی الدین، محمد اسعد اور محمد منصور علی کے علاوہ سید حمید الدین احمد محمود نے کہا کہ کوئی آر ایس مرکار اور چندر شیکھر راؤ کو نئی ریاست تلنگانہ میں خوشحالی لانے، تلنگانہ کے عوام کے مسائل کو حل کیے جانے کی سمت اقدام کے لیے وقت درکار ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ ساتھ ہی انھوں نے کہا کہ اردو کو سرکاری سطح پر فروغ دینے کے لیے اقدام ضروری ہے۔ تلنگانہ کے تمام اضلاع میں اردو مترجمین اور اردو واقف کار عوامی رابطہ افسر کے تقرر پر بھی خصوصی اور سنجیدہ اقدام ضروری ہے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

ڈاکٹر یونس غازی شعبۂ اردو، میرٹھ کالج کے صدر نامزد

میرٹھ (پریس ریلیز، 26 نومبر)۔ اردو کے مشہور شاعر، ناقد اور محقق ڈاکٹر محمد یونس غازی میرٹھ کالج کے شعبۂ اردو کے صدر مقرر ہوئے ہیں۔ واضح ہو کہ طویل عرصے سے اس عہدے پر ڈاکٹر خالد حسین خاں متمکن تھے۔ موصوف کے ریٹائرڈ ہوجانے کے بعد یہ عہدہ ڈاکٹر یونس غازی کو تفویض ہوا ہے۔

ڈاکٹر یونس غازی ایک طویل عرصے سے اسی شعبہ میں تدریسی خدمات پر مامور تھے۔ موصوف شہرت و ناموری کی پرواہ کیے بغیر مسلسل اردو ادب کی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ اخبارات و رسائل میں پابندی سے ان کا کلام بھی شائع ہوتا رہتا ہے۔ ساتھ ہی ان کے دو مجموعے 'لمحات' (2010) اور 'خواب سمندر' (2013) زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر داد و تحسین حاصل کرچکے ہیں۔ ڈاکٹر یونس غازی عمدہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ اب تک ان کی متعدد تحقیقی و تنقیدی کاوشیں سامنے آچکی ہیں جس میں 'مسائل شریعت' (1981)، 'ماہنامہ الناظر لکھنؤ ایک مطالعہ' (1995)، 'انجمن ترقی اردو ہند: تاریخ اور خدمات 1947 تک' (2004)، 'اردو ادب کے فروغ میں ہندستانی اکیڈمی کا حصہ' (2012) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

میونسپل اردو اسکول کے 100 طلبہ کتابوں سے اب تک محروم

بھوپال (۱۸ نومبر)۔ میونسپل اسکولوں کا معیار تعلیم گرتا کیوں جارہا ہے، اس کی ایک وجہ شہری انتظامیہ کی لاپروائی بھی ہے۔ یہ بات اس وقت سامنے آئی جب پتا چلا کہ اٹاپ ہل کے ایک اسکول میں آٹھویں جماعت کے تقریباً 100 بچے اب تک کتابوں سے محروم ہیں۔

اٹاپ ہل کے میونسپل اردو اسکول میں زیر تعلیم ایک طالب علم کے والدین نے نمائندہ کو بتایا کہ ان کے بیٹے کو ابھی تک میونسپل کارپوریشن کی جانب سے کتابیں نہیں ملی ہیں اور جو کاپیاں ملی تھیں وہ بھی ختم ہوگئی ہیں۔

کانے نگر میونسپل اسکول سے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے سماجی کارکن محمد کلیم شیخ نے بتایا کہ مذکورہ اسکول میں پہلی تا آٹھویں جماعت کے تقریباً 250 بچے زیر تعلیم ہیں، ان میں سے آٹھویں جماعت کی ۴ ڈویژنوں میں 200 بچے پڑھتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ معلومات حاصل کرنے پر پتا چلا کہ تقریباً 100 بچوں کو اب تک کتابیں نہیں ملی ہیں۔ بچوں کے پاس کتابیں نہ ہونے سے وہ گھر پر پڑھتے ہی نہیں اور ان کا ہوم ورک بھی نہیں ہوتا۔ انھیں جب پڑھنے کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اسکول سے کتابیں ہی نہیں ملی ہیں تو ہم کیا پڑھیں گے۔

اس سلسلے میں نمائندے نے اسکول کے ایک معلم سے گفتگو کی تو انھوں نے کہا کہ ساتویں جماعت سے جو بچے آٹھویں جماعت میں آئے ہیں ان کی لسٹ بناکر محکمۂ تعلیم کو دی گئی تھی اور اسی کے مطابق یہاں کتابیں آئی تھیں۔ جن طلبہ نے دوسرے اسکولوں سے آکر یہاں داخلہ لیا ہے ان کے نام پر کتابیں نہیں آئیں۔ حالاں کہ جن بچوں کو کتابیں نہیں ملی ہیں ان کی بھی تفصیلات انتظامیہ کو بھیجی گئی تھی لیکن اب تک یہ طلبہ کتابوں سے محروم ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ کئی طلبہ کے پاس کاپیاں بھی نہیں ہیں، انھیں جو کاپیاں دی گئی تھیں وہ ختم ہوگئی ہیں اور اکثر بچے یہ کہہ کر کاپیاں مکمل نہیں کرتے کہ ان کے والدین کاپیاں خرید کر نہیں دیتے۔

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ جب اسکول کے ہیڈ آفیسر مختار احمد سے اس بارے میں گفتگو کی گئی تو انھیں یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اسکول کے بچوں کے پاس کتابیں نہیں ہیں۔ ٹیچروں کے ذریعے انتظامیہ سے کتابوں کا مطالبہ کیا گیا ہے لیکن ۵ ماہ گزر جانے کے بعد بھی اب تک کتابیں دستیاب نہیں ہوسکی ہیں تو انھوں نے یہ کہہ کر کتابیں فراہم کرنے کی یقین دہانی کرائی کہ انتظامیہ سے اس بارے میں بات چیت کرکے معاملے کو حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(اردو ایکشن۔ بھوپال)

گرامی نامے

ادارے کا مراسلہ نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے

یوم اردو کے تعین کا مسئلہ: چند معروضات

مکرمی! آپ نے ہفت روزہ 'ہماری زبان' میں 'یوم اردو کے تعین کا مسئلہ' پر نہایت دوررس نتائج کا حامل مضمون تحریر فرمایا ہے۔ اس ضمن میں چند باتیں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا آزاد نے اردو کی بقا اور تحفظ میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لعل نہرو کی کوششوں سے اردو کو آزاد ہندستان میں قانونی درجہ حاصل ہوا جس کی بنیاد پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے میمورنڈم پیش کیا اور دیو نارائن پانڈے، ہے بہادر سنگھ نے اپنی جان عزیز قربان کردی۔ اگر اردو کی آئینی حیثیت مستحکم نہ ہوتی تو احتجاجات کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوتا اور کئی ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ بھی حاصل نہ ہوتا۔ نظام جمہوریت میں کسی بھی حق کو حاصل کرنے کے لیے اس کی آئینی حیثیت کا سوال سب سے پہلے اٹھتا ہے۔ آئین ہی وہ بنیادی اساس ہے جس پر نظام جمہوریت قائم ہے۔ جذباتی حقائق پر سیاسی حقائق کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اردو اساتذہ کی تقرری کا معاملہ ہو یا اردو اخبارات و رسائل کو دی جانے والی مالی امداد، بھی مسائل آئینی طور پر ہی حل کیے جاسکتے ہیں۔ جذباتی نعرے بازی سے کسی مسئلے کو حل نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا آزاد نے وقت کی نزاکتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے ایک بنیادی اور اہم دانشورانہ فیصلہ کیا تھا ورنہ آج اردو زبان کے حقوق کی بازیابی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کا یہ فیصلہ کہ آج اگر ہندستان میں اردو زندہ ہے تو اس کا سہرا مولانا آزاد کے سوا کسی اور کے سر نہیں باندھا جاسکتا، بالکل درست ہے۔

دور سیاست میں کسی بھی مسئلے کے حل میں سیاسی قانون کے علاوہ سیاسی شخصیت، سیاسی جماعت اور سیاسی میڈیا کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندستانی وزیر تعلیم ہونے کے ناطے یہ سیاسی قوت و طاقت صرف مولانا آزاد کو حاصل ہے۔ بعض افراد اس پر معترض ہوسکتے ہیں، لیکن انھیں اس حقیقت کو قبول کرنے میں حائل نہ ہوگا کہ اردو کی کاروباری حیثیت کے تعین میں، اساتذہ کی تقرری کے معاملات میں، نیز زبان و ادب کے فروغ میں ہندستانی سیاست دانوں کی حمایت کی ضرورت ہے۔ 'یوم اردو' کی اختراع اور تقاریب کے انعقاد کے سلسلے میں کی جاری تمام کوششیں سیاسی ہیں۔ یہ کوئی جذباتی، اخلاقی، تاریخی اور مذہبی مسئلہ نہیں ہے۔ حکمت عملی اور دور اندیشی کا تقاضا یہی ہے کہ 9 نومبر پر اصرار نہ کیا جائے۔

ڈاکٹر محمود شیخ
502، نیا محلہ، مرزا غالب مارگ
جبل پور 482002، مدھیہ پردیش

اسکولوں اور کالجوں میں 'اردو کی تدریس بہ حیثیت زبان دوم' ختم کرنے کی کوششیں

حیدرآباد۔ دونوں ریاستوں آندھرا اور تلنگانہ کے مختلف خانگی اسکولوں اور کالجوں سے 'اردو بہ حیثیت زبان دوم' کو منصوبہ بند طریقے سے بتدریج ختم کیا جارہا ہے۔ کئی ایک سرپرستوں و طلبہ نے شکایت کی ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اردو بہ حیثیت زبان دوم اختیار کریں تاہم انھیں یہ جان کر سخت تکلیف پہنچی کہ محض لیکچرر یا ٹیچر کے نہ ہونے کا بہانہ کرتے ہوئے کئی ایک کالجوں اور اسکولوں میں اردو زبان کی تدریس عمداً ترک کی جارہی ہے۔ سرپرستوں نے جن میں کئی ایک اپنے بچوں کو اردو ذریعہ تعلیم یا کم از کم بہ طور دوسری زبان (سیکنڈ لینگویج) پڑھانے میں دل چسپی رکھتے ہیں، یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ اب جب کہ تعلیمی سال کو شروع ہوئے 5 ماہ کا عرصہ ہوچکا ہے تاحال شہر کے 93 فیصد انٹرمیڈیٹ خانگی کالجوں میں اردو بہ طور زبان دوم نہیں پڑھائی جارہی ہے حالاں کہ حیرت کی بات یہ ہے کہ بعض ایسے کالجوں میں جہاں اردو سے دل چسپی رکھنے والے طلبہ موجود ہیں وہاں سنسکرت و دیگر زبانوں کو بہ طور زبان دوم پڑھایا جارہا ہے تاہم اردو کے لیے کوئی انتظام نہیں ہے۔ سرپرستوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ مرکزی حکومت اور کہ ریاستی حکومتیں اردو سے متعلق بڑے بڑے دعوے کرتے آئے ہیں جب کہ عملی طور پر کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ شہر کے 93 فیصد خانگی کالجوں اور بعض مشنری اسکولوں میں سرے سے اردو زبان دوم کا کوئی انتظام ہی نہیں ہے اور محض اساتذہ کی کمی کا بہانہ بنایا جاتا ہے جب کہ اعداد و شمار کے مطابق آندھرا و تلنگانہ کی یونیورسٹیوں کے علاوہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے ہر سال سیکڑوں طلبہ ایم اے اردو کی تکمیل کے بعد بے روزگاری کا شکار ہیں۔ اس کی تمام تر ذمہ داری حکومت وقت کے ساتھ تمام اردو اداروں، اساتذہ اور اکیڈمیوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔ تلنگانہ حکومت کو چاہیے کہ ایک خصوصی جی او کے ذریعے تمام اردو گریجویٹس کو روزگار مہیا کرے اور خصوصی طور پر سروے کیا جائے کہ کن کن مدارس اور کالجوں میں اردو کو بہ طور زبان دوم تاحال نہیں پڑھایا جارہا ہے ان کے خلاف کارروائی کی جائے، نیز اردو اورینٹل اسکول قائم کرتے ہوئے اردو گریجویٹس کی بے روزگاری کا خاتمہ کیا جائے اور سرکاری مدارس اور کالجوں میں بھی اردو اساتذہ کی خالی اسامیوں کو پُر کیا جائے تاکہ اردو زبان جو کہ عالمی زبان کا درجہ رکھتی ہے اور ماضی میں اس کے ذریعے جس طرح روشن اور شاندار کارنامے انجام دیے گئے وہ جاری رہ سکیں۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

جھارکھنڈ میں اردو اکیڈمی کی تشکیل نہ کیے جانے پر مایوسی

رانچی۔ انجمن بقائے ادب، رانچی کے سکریٹری نصیر افسر نے کہا کہ ریاست جھارکھنڈ کی تشکیل ہوئے تیرہ سال ہوگئے۔ پہلے یہ بہار کا حصہ تھا۔ تشکیل جھارکھنڈ سے قبل ہمیں فخر تھا کہ ہماری ریاست بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے اور اردو اکیڈمی بھی تھی۔ نئی ریاست جھارکھنڈ کی تشکیل ہوتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ ہماری زبان اور ہماری تہذیب سب لٹ گئی۔ عجب اتفاق کہیے کہ ریاست جھارکھنڈ کو مسلسل تین مسلمان گورنر ملے جن میں موجودہ گورنر ڈاکٹر سید احمد سے قبل ایم اے ایچ فاروق مرحوم اور سید سبط رضی تھے۔

مرحوم فاروق کا ہندی یا اردو سے کوئی تعلق نہیں تھا، وہ گفتگو بھی انگریزی میں ہی کرتے تھے۔ رہی سید سبط رضی صاحب کی بات تو وہ خالص اردو والے تھے۔ لباس، گفتگو کے علاوہ چال ڈھال سے اردو تہذیب چھلکتی تھی۔ غرض یہ کہ اردو تہذیب کے جیتے جاگتے نمونہ تھے۔ ان کے دور میں بھی صدر راج قائم ہوا۔ پوری ریاست جھارکھنڈ کی حکومت ان کی مٹھی میں تھی۔ چاہتے تو وہ اردو اکیڈمی کی تشکیل کرسکتے تھے مگر انھیں نہیں کرنا تھا نہیں کیے۔

موجودہ گورنر کے دور میں بھی صدر راج نافذ ہوا اور ایک مرتبہ پھر اردو داں گورنر کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور تھی۔ اردو داں طبقہ ایک بار پھر خوش ہوا کہ چلو اچھا موقع آیا ہے اور عزت مآب ضرور جھارکھنڈ اردو اکیڈمی کی تشکیل کریں گے لیکن وقت کب کس کا انتظار کرتا ہے، صدر راج کا وقفہ ختم ہوتے ہی اردو حلقہ پھر مایوس ہوگیا۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

غالب انسٹی ٹیوٹ کے ایوارڈز کا اعلان

نئی دہلی (پریس ریلیز)۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ایوارڈ کمیٹی کی ایک اہم میٹنگ 13 دسمبر 2013 کو ایوان غالب میں جسٹس آفتاب عالم کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، پروفیسر شمیم حنفی، اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر موجود تھے۔ اس اہم موقع پر تمام ممبران نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے پُروقار غالب انعامات 2013 کے 6 اہم انعامات پر فیصلہ کیا۔ اردو کے ممتاز ناقد، دانشور اور کئی اہم کتابوں کے مصنف پروفیسر قاضی افضال حسین کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے اردو تحقیق و تنقید سے سرفراز کیا جائے گا۔ فارسی کے نامور اسکالر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے سابق صدر پروفیسر نبی ہادی کو فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے فارسی تحقیق و تنقید کے لیے منتخب کیا گیا۔ معروف افسانہ نگار اور کئی بڑے ناولوں کے مصنف عبد الصمد کا نام غالب ایوارڈ برائے اردو نثر کے لیے طے کیا گیا۔ عہد حاضر کے نامور شاعر مظفر ایجاز کا نام غالب انعام برائے اردو شاعری کے لیے تجویز کیا گیا۔ ہم سب غالب انعام برائے اردو ڈرامہ کے لیے مشہور ڈرامہ نگار اور اپنی منفرد اداکاری کے ذریعے اردو زبان و ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کرنے والے ہر دلعزیز اداکار ٹام آلٹر کے نام پر اتفاق ہوا اور مجموعی ادبی خدمات کے لیے ممتاز نقاد، کئی کتابوں کے مصنف اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر شمس الحق عثمانی کے نام پر تمام لوگوں نے اتفاق کیا۔ یہ تمام ایوارڈز بین الاقوامی غالب تقریبات کے افتتاحی اجلاس میں 19 دسمبر 2013 کو سرٹیفکیٹ، مومنٹو اور 75 ہزار روپے نقد کے ساتھ عطا کیے جائیں گے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ پچھلے 40 برسوں سے 200 سے زائد انعامات اردو، فارسی، ادب، صحافت، ثقافت، سائنس اور مختلف میدانوں میں کام کرنے والے اہم دانشوروں کو ان کی گرانقدر خدمات کے لیے نواز چکا ہے۔ غالب ایوارڈ کی ایک اہم خاصیت یہ بھی ہے کہ اردو اور فارسی کے اساتذہ اور باشعور اور نامور ہستیوں کے مشوروں کو بھی نظر میں رکھ کر ایوارڈ کمیٹی انعامات کا فیصلہ کرتی ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی، فارسی یونیورسٹی میں دفتری کام کے لیے کوئی ملازم نہیں

لکھنؤ (4 نومبر)۔ اترپردیش میں اردو، عربی، فارسی زبانوں کے فروغ کے لیے خواجہ معین الدین چشتی یونیورسٹی قائم ہے۔ موجودہ ریاستی حکومت بھی پُرعزم ہے لیکن یونیورسٹی انتظامیہ کے کام کرنے کا طریقہ اتنا سست ہے کہ نہ صرف یونیورسٹی کے کام متاثر ہورہے ہیں بلکہ وہاں تعینات کنٹریکٹ ملازمین کی ملازمت بھی خطرے میں پڑگئی ہے۔ حالات یہ ہیں کہ پہلے یونیورسٹی نے اپنے طور پر کچھ کنٹریکٹ ملازمین کو رخصت کیا اس میں چند کی تو واپسی ہوگئی تھی لیکن اس مرتبہ یونیورسٹی کو کنٹریکٹ ملازمین مہیا کرانے والی ایجنسی ہی تبدیل ہوگئی، جس کی وجہ سے تمام غیر تدریسی عملے کی رخصتی ہوگئی۔ فی الوقت یونیورسٹی میں کوئی بھی کلرک درجہ چہارم ملازم نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی انتظامیہ کا کہنا ہے کہ ملازمین کی نئے سرے سے تقرری کے لیے نئی ایجنسی کا تعین کرلیا گیا ہے، توقع ہے کہ جلد ہی ایجنسی ملازمین مہیا کرادے گی۔ تفصیلات کے مطابق 2010 میں قائم خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی، فارسی یونیورسٹی میں گزشتہ تین روز سے غیر تدریسی عملے میں درجہ سوم و چہارم کا کوئی بھی ملازم نہیں ہے۔ چوں کہ ابھی تک یونیورسٹی میں درجہ سوم و چہارم کے مستقل ملازمین کی تقرری

(بقیہ صفحہ 7 پر)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : مبادیاتِ تحقیق
مصنف : عبدالرزاق قریشی
ضخامت : ۱۱۹ صفحات
قیمت : ۱۰۰ روپے
ناشر : انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ۹۲-بی، بادابھائی نوروجی روڈ، ممبئی-۴۰۰۰۰۱
تبصرہ نگار : امیر حمزہ
ameerhamzah033@gmail.com

'مبادیاتِ تحقیق' فنِ تحقیق میں ایک ایسی کتاب ہے جس سے تحقیق کا ہر طالب علم واقف ہے۔ چاہے وہ استاد ہو، ریسرچ اسکالر یا عام محقق وہ اس کتاب سے واقفیت رکھتا ہے۔ اکثر اساتذہ جب شاگردوں کو فنِ تحقیق سے متعلق کچھ بھی بتاتے ہیں تو ان کے سامنے یہ کتاب ہوتی ہے۔ ریسرچ اسکالر/محقق بطور حوالہ پیش کرنے میں اس کتاب سے صرفِ نظر نہیں کر پاتے اور اس کتاب کو فنِ تحقیق میں قدم قدم پر استعمال کرتے ہیں۔

اس کتاب کا پہلا اڈیشن کافی عرصے قبل مارکیٹ سے غائب ہو چکا تھا۔ اساتذہ کے پاس اس کتاب کے بوسیدہ فوٹو اسٹیٹ موجود ہیں جس سے وہ خود استفادہ کرتے ہیں اور طالب علموں کو بھی اس کے اقتباسات سے نوازتے۔ اب یہ بہت ہی خوشی کی بات ہے کہ پروفیسر عبدالستار دلوی صاحب نے دوبارہ اس کتاب کو شائع کیا ہے۔ پروفیسر عبدالستار دلوی صرف اس کتاب کو شائع کروانے میں ہی معاون ثابت نہیں ہوئے بلکہ تذکرہ و تعارف کے عنوان سے ایک اہم مضمون شامل کتاب کیا ہے جس میں کتاب اور صاحبِ کتاب کے احوال اور ان کے علمی اور تحقیقی کاموں پر اجمالی عمدہ روشنی ڈالی گئی ہے۔

'مبادیاتِ تحقیق' فنِ تحقیق کے میدان میں ایک ایسی کتاب ہے جو آج بھی اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ کتاب سب سے پہلے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے بعد فنِ تحقیق میں بہت ساری کتابیں تصنیف ہوئی اور بہت ساری کتابوں کو ترتیب دیا گیا۔

لیکن پھر بھی 'مبادیاتِ تحقیق' کی قدر و منزلت میں کسی طور پر کمی نہیں آئی۔ آخر اس چھوٹی سی کتاب میں کیا ہے جسے اپنی بہت ساری خصوصیات کی بنا پر فنِ تحقیق میں ام الکتب کی حیثیت حاصل ہے۔ حالاں کہ یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے "خیر الکلام ما قل ودل" "بہترین بات وہ ہے جو مختصر اور مدلل ہو۔"

اس کتاب کو عبدالرزاق قریشی نے چھ بابوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب فنِ تحقیق ہے۔ اس باب میں تحقیق، اس کی خصوصیات اور قسموں سے متعلق پانچ ذیلی عنوان بھی شامل ہیں۔ دوسرا باب ہے 'لائبریری کا استعمال' یہ ایک ایسا باب ہے جو عبدالرزاق قریشی کو دوسرے مصنفین سے ممیز کرتا ہے۔ اس باب میں انھوں نے بتایا ہے کہ لائبریری استعمال کرنے کے طریقے کیا ہیں، اس میں ڈیوی ڈیسمل سسٹم کیا ہوتا ہے اور اس کو ہم خود اپنی ذاتی لائبریری کے لیے کس طرح استعمال کر سکتے ہیں۔ رسالوں سے استفادہ کے طریقے کیا ہیں اور لائبریریوں کے مطبوعہ کیٹلاگوں سے کس طرح استفادہ کیا جائے اور لائبریریوں کا کیٹلاگ ایک محقق کے لیے کتنا ضروری ہے۔ اس باب میں کس کس لائبریری کے کیٹلاگ شائع ہو چکے ہیں ان سب کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر بابوں میں مقالہ کی تیاری، مقالہ کی تسوید، حاشیہ، کتابیات، اشاریہ، نسخوں کی تلاش اور حصول، نسخوں کے مراتب اور مقدمہ و تعارف کے متعلق مفصل گفتگو کی گئی ہے۔

اخیر میں ضمیمہ کے تحت ڈاکٹر صلاح الدین المنجد کا 'متنی تنقید' پر عالمانہ مقالہ کا ترجمہ بھی شامل کتاب کیا گیا ہے۔ ترجمہ ڈاکٹر فضل الرحمن ندوی صاحب کا ہے جس سے کتاب کی معنویت و افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں معروضی انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔

□□□

نام کتاب : درونِ سخن
مصنف : اعجاز صدیقی (مرحوم)
مرتب : افتخار امام صدیقی
ضخامت : ۱۰۷ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ناشر : مکتبہ قصر الادب، ۲۰۳/۲۲۸ دینا ناتھ بلڈنگ، تیسرا منزلہ روم نمبر ۱۲، وی پی مارگ ممبئی-۴۰۰۰۰۴
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

اردو ادب سیماب اکبرآبادی اور ان کے وارثوں کی مرہونِ منت ہے جو سالہا سال سے اس زبان کی خدمت کرتے رہے ہیں اور ماہنامہ 'شاعر' ممبئی کی اشاعت میں اپنا تن من دھن لگاتے رہے ہیں۔ اس رسالے کو نکھارنے میں اعجاز صدیقی (مرحوم) کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ صحافت کے علاوہ انھیں شعر، تنقیدی مضامین، تبصرے، افسانے اور انشائیے لکھنے کا شوق تھا مگر ان کی نگارشات کا بیشتر حصہ ابھی تک کتابی صورت میں سامنے نہیں آیا ہے۔ انھوں نے اپنی حیات میں ایک نظم بعنوان 'خوابوں کا مسیحا' (اردو، انگریزی و ہندی) شائع کی تھی جب کہ ان کا شعری مجموعہ 'کربِ خود کلامی' ان کے انتقال کے بعد تاجدار احتشام صدیقی نے مرتب کر کے شائع کیا۔ زیرِ نظر کتاب کی ترتیب کی شروعات بھی ان کے بیٹے تاجدار ہی نے کی تھی مگر اچانک رحلت کے سبب یہ کام التوا میں پڑ گیا اور اب اتنے برسوں کے بعد افتخار امام صدیقی نے اس کام کو سرانجام دیا ہے۔ تاجدار کا ایک مضمون بہ عنوان 'اعجاز صدیقی: ایک مختصر خاکہ' کتاب میں شامل ہے جس میں مصنف کی شخصیت اور فن پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ مندرجہ ذیل شعر ان کی زندگی کی بازگشت ہے:

> یہ نظم و نثر کے اوراق ہیں کفن اپنا
> جو موت آئے تو کتابوں کے درمیاں آئے

اعجاز صدیقی کی شاعری کا آغاز ۱۹۵۰ء میں آگرہ سے ممبئی نقل مکانی کرنے سے پہلے ہی ہوا تھا۔ وہ اپنے والد علامہ سیماب اکبرآبادی سے اصلاح لیتے تھے۔ غزل اور نظم دونوں پر یکساں دسترس حاصل تھی۔ زندگی بھر ترقی پسند تحریک سے جڑے رہے حالاں کہ ترقی پسندوں نے انھیں غلطیوں سے جڑ جانے میں کوئی مدد نہیں کی، البتہ ممتاز شاعر شکیل بدایونی نے ان کے لیے کوشش ضرور کی تھی مگر ادبی اور صحافتی مصروفیات نے انھیں فلموں سے دور رکھا۔ بقول افتخار امام صدیقی "(اعجاز صدیقی) کی غزلیہ شاعری ان کے ترقی پسند معاصرین سے ہر سطح پر علاحدہ اور منفرد ہے۔" "اعجاز صدیقی کی شاعری ان کے دور کا آئینہ ہے۔ ان کے یہاں نئی ترکیبوں کا استعمال اور نئی زمینوں کی کھوج ملتی ہے جو انھیں اپنے معاصرین سے ممیز کرتی ہے۔ روایتی شاعری سے وہ پرہیز کرتے ہیں اور گل و بلبل اور چمن و گلستاں کی تجسیم ایک نئے ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ وہ بلدیاتی انتشار سے مسخ شدہ انسان کے کرب کو سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں غم و اندوہ کا سلسلہ حوصلہ شکن نہیں بلکہ خوش کن ہے۔ ملاحظہ کیجیے چند اشعار

> یہ ایک عالم بے رنگ و کیف و آرزو
> رواں دواں اسی عالم میں زندگی ہے مگر

> بے لوثِ آوارہ بھی پابندِ گلستاں
> بیرون چمن ہوئے چمن کس کو ملی ہے

> وہ سے خودسری صورت بگڑتی ہے کمل
> جاتے کہاں پاس سے ہر شخص تو الگتا ہے

> ہم نام ہمسایہ، ہم شکل سا، ہم صورت وہ سا
> مجھ سا ہی کوئی شخص مرے ساتھ رہا ہے

> دل کے دیجیے کس کس کی پرستش کیجیے
> آج کے دور کا ہر بت ہی خدا لگتا ہے

اعجاز صدیقی ترقی پسند تحریک کے اہم رکن رہے مگر یہ تحریک اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ پائی، اس لیے، انھوں نے اپنی اور اپنے ہم نواؤں کی جد و جہد کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کیا ہے:

> خوفِ زنجیر بھی تھا، خدشۂ تعزیر بھی تھا
> پھر بھی اک جرأتِ اظہار سے ہم گزرے ہیں

> اس خرابے میں دبے جائیں اذانِ تعمیر
> لذتِ حاصلِ تعمیر ملے یا نہ ملے

اعجاز صدیقی کے یہاں پختہ اور بالیدہ سماجی و سیاسی شعور ملتا ہے۔ انھوں نے جس جمہوری نظام میں زندگی گزاری وہ بقول ان کے تعمیری کم اور تخریبی زیادہ ہے۔ کہیں کہیں وہ دوراندیش بھی ثابت ہوئے ہیں کیوں کہ جو کچھ موجودہ زمانے میں ہو رہا ہے اس کی پیش گوئی انھوں نے بہت سال پہلے اپنے اشعار کے ذریعے کی ہے:

> ابھی نہیں ہیں آبلہ پائی کی زحمتیں
> بٹنے لگی ہے ارضِ وطن، دیکھ کر چلو

> پھر سے سجا رہے ہیں اندھیروں کی انجمن
> وہ تیرہ بخت جن کو ہے روشنی سے زخم

> موجوں کو ساتھ دے دیں گی ٹوٹی ہوئی پتواریں
> کشتی کا خود ہی نا خدا ہوں، کشتی سے رشتے ہیں چند

> وہی قاتل بھی، منصف بھی وہی ہے
> جو دیتے واسطوں سے دھو رہے ہیں

> چمن پر چھاپے ڈالنے کی ہو رہی ہیں کوششیں
> ہم سے وہ حالات بھی اعجاز پوشیدہ نہیں

> قتل گاہیں روز نئے اعجاز سجتی ہیں یہاں
> سیکڑوں خنجر نکل آتے ہیں اک قاتل کے ساتھ

> ہمارے خون کے چھینٹے ہیں جس کی زینت پر
> سنو جناب! گلشن کی داستاں ہم سے

> چراغ کل بھی تھے روشن، مگر اجالا تھا
> چراغ اب بھی ہیں روشن، مگر اندھیرا ہے

چوں کہ شاعر کے پاس ایک وژن ہے اور مستقبل کا خاکہ ہے، اس لیے وہ ہمیشہ پر امید رہتے ہیں۔ ان کی رجائیت پسندی ان کے اشعار میں صاف جھلکتی ہے:

> کٹے گل بن کے مہکا ہے فضاؤں میں ہمیں
> چاندنی بن کے گلستاں میں بکھرنا ہوگا

> ہر ہر قدم پہ فطرتِ خوددار کارساز
> بند ایک در ہوا تو کئی اور در کھلے

> تکمیلِ آرزو کا تحفظ محال ہے
> اس رہگزارِ شوق میں جب تک لٹا نہ جائے

> منزل کی سمت قافلے ہر دم رواں رہیں
> طوفان انھیں کی آندھیاں آئیں رکا نہ جائے

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اعجاز صدیقی کی شاعری انفرادی شعور اور اجتماعی شعور کا خوب صورت امتزاج ہے جو ایک جانب انسان کو آنے والی قلقتوں سے آگاہ کرتی ہے تو دوسری جانب روشن مستقبل کی نوید دیتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو کے اس ممتاز خدمت گار کی طرف نقادوں کا اتنا دھیان نہیں گیا ہے جتنا ان کا حق تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کی نگارشات ہنوز بکھری پڑی ہیں اور کتابی صورت میں آنے کی منتظر ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اردو قارئین زیرِ نظر مجموعے کا بھرپور خیر مقدم کریں گے اور مکتبہ قصر الادب ان کی باقی ماندہ تحریروں کو بھی کتابی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔

□□□

بقیہ: حالی اور شبلی کی... ظرافت پسندی

لکھیے۔ مولانا حبیب الرحمان شروانی نے مولانا شبلی کی کتاب 'شعرالعجم' پر ایک بے حد تعریفی ریویو لکھا تھا۔ اُسے ملاحظہ کرکے شبلی نے انھیں لکھا:

"آپ نے 'شعرالعجم' کی جو مدح کی ہے کہ میں نے خود اس پر دوبارہ اس لحاظ سے نظر ڈالی کہ یہ خط و خال اُس میں ہیں بھی یا اس میں بھی چشمِ مجنوں کی قوتِ اختراع ہے!"

ایم مہدی حسن (مہدی افادی) اور شبلی، دونوں ہی ایک دوسرے کی طرزِ تحریر کے مداح تھے۔ مہدی نے اپنے ایک خط میں ان کے کسی مضمون کی داد دی تو شبلی نے انھیں تحریر کیا: "...آپ کا تو خط بھی ایک دل چسپ آرٹیکل ہوتا ہے، لیکن اگر اس کی داد دوں تو ہم دونوں 'حالی' ہوتے جاتے ہیں۔"

جب 'حیاتِ جاوید' شائع ہوئی تو نواب محسن الملک نے اُس پر تبصرہ لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اسی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا حالی نے ایک دوست کو اپنے خط میں لکھا تھا کہ: "...مگر اُن کا ارادہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ہر مسلمان حج کا ارادہ رکھتا ہے۔" 'حیاتِ جاوید' پر جب مولوی عبدالحق کا ریویو آیا تو انھیں لکھتے ہیں: "'حیاتِ جاوید' پر آپ کا ریویو دیکھا۔ جو کلمات بہ تقاضائے محبت تصنیف اور مصنف کے حق میں بے اختیار آپ کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں اگرچہ میں اپنے تئیں ان کا مستحق نہیں سمجھتا، لیکن بہرحال آپ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض جانتا ہوں۔ یہ وہی خصلت ہے جس کو اہلِ ایران 'یار فروشی' کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور ہماری زبان میں 'مجھوک بجھوک کر بیچنا' کہتے ہیں۔"

ہمارے یہ بزرگ بھی ناشروں کے ناز نخروں سے نالاں رہا کرتے تھے۔ مولانا شبلی نے 'نامی پریس کان پور' کی حسنِ طباعت دیکھ کر 'الفاروق' وہیں چھپوائی تھی۔ منشی رحمت اللہ رعد کتاب چھاپ کر دینے میں مہینوں کیا کبھی کبھی برسوں لگا دیتے تھے۔ 'سوانح مولانا روم' انھیں اس تاکید کے ساتھ دی گئی تھی کہ جلد چھپنے میں مل جائے لیکن بقول عبدالرزاق کانپوری، جو کہ شبلی کی کتابوں کے پروف ریڈر اور نگراں ہوا کرتے تھے، کئی سال لگ گئے۔ شبلی نے اُن سے کہا کہ 'وہ توبہ کرتے ہیں جو آیندہ بھی رعد کے یہاں کتاب چھپوائیں، بس یہ کتاب نکل آئے۔' جب 'سوانح مولانا روم' چھپ گئی تو شبلی اگلے ہی سال دوسری کتاب لے آئے۔ کانپوری مرحوم نے انھیں یاد دلایا کہ وہ توبہ کرچکے ہیں۔ شبلی نے جواب دیا: "میری حالت اُس حاملہ عورت کے مشابہ ہے جو دردِ زہ کی تکلیف سے مجبور ہوکر عہد کرتی ہے کہ اب وہ کام نہ کرے گی جو باعثِ دردِ زہ ہو، لیکن وضعِ حمل کے بعد وہ اپنے عہد پر قائم نہیں رہتی۔ یہی میرا اور رحمت اللہ رعد کا حال ہے۔ جب کتاب طبع ہوکر آجاتی ہے تو پچھلی باتیں بھول جاتا ہوں۔" (باقی آیندہ)

بقیہ: ہندستانی زبان کا مسئلہ

تلاش کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ 'ہندستانی' کا پیوند کس سے جوڑا جائے، سنسکرت سے یا عربی اور فارسی سے۔

ہمیں یہ کہتے ہوئے ذرا بھی جھجک نہیں کہ سنسکرت ایک مردہ زبان ہے اور اس سے اپنی زبان کا پیوند باندھنے کا مطلب صاف لفظوں میں یہ ہے کہ ہم اپنی زبان کے لیے قبر کھود رہے ہیں۔ دوسری طرف عربی اور فارسی زبانیں بدیسی زبانیں ہیں اور روز بروز بھولی بسری ہوتی جارہی ہیں، اس لیے زبان کا ان سے پیوند لگانا بھی ہمارے لیے کسی طرح مفید نہیں ہوسکتا۔

اب ہمارے لیے صرف ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ایمان داری کے ساتھ زبان کو زیادہ آسان بناتے چلے جائیں اور بس۔ اس کے بعد جب جتنی تیزی کے ساتھ دوسرے صوبوں کے لوگوں سے ملتے جلتے جائیں گے ہماری ہندستانی زبان کی بناوٹ اور سجاوٹ غیر محسوس طور پر بدلتی چلی جائے گی ورنہ دوسری کوششیں اس فرقہ پرستی کے دور میں یقینی طور پر نقصان دہ ثابت ہوں گی۔

اس سلسلے میں ہم یہ کام کرسکتے ہیں کہ ایک آل انڈیا کمیٹی بنائی جائے جس کی شاخیں ہر صوبے میں ہوں اور یہ شاخیں سب سے پہلا کام یہ کریں کہ اپنے صوبے کی زبان کے ایسے لفظوں کو اکٹھا کردیں جو دوسرے صوبے میں بولے اور سمجھے جاتے ہوں۔ ساتھ ہی دوسرے صوبوں کی زبانوں کے لفظوں کو بھی اکٹھا کردیں جو اُن کے صوبے کی زبان میں استعمال کیے جاتے ہوں، پھر آل انڈیا کمیٹی زیادہ عام لفظوں کو چُن کر ہندستانی مان لے۔

لیکن یہ سب کچھ جبھی ممکن ہے کہ تمدن، کلچر وغیرہ کے مفروضے ہمارے دماغوں سے نکل جائیں اور ہم اپنی سیاسی اور سماجی زندگی میں ایک ہی رجحان پیدا کرلیں، اس لیے ہمیں زبان کو ایک کرنے سے پہلے اپنی سیاسی اور سماجی زندگی کو ایک بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

◎◎◎

بقیہ صفحہ ۵ سے آگے

نہیں ہوئی ہے جبکہ یونیورسٹی انتظامیہ نے یونیورسٹی کے فائل ورک کے لیے ایجنسی کے توسط سے کمپیوٹر آپریٹر، کلرک، اسٹینو گرافر، چپراسی وغیرہ کے عہدوں پر 47 امیدواروں کی بہ طور کنٹریکٹ ملازمین تقرری کی، تب سے یہ ملازمین یونیورسٹی میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی یونیورسٹی میں دو دیگر ایجنسیاں منسلک ہیں جن میں سے ایک نے صفائی ملازمین مہیا کرائے ہیں اور دوسری ایجنسی نے سیکورٹی گارڈ۔ اس طرح یونیورسٹی میں تدریسی عملے کے علاوہ غیر تدریسی عملے کے بہ طور صرف دو معاون اکاؤنٹ افسر ہیں جب کہ وائس چانسلر، فائنس افسر، رجسٹرار حکومت کی جانب سے تعینات کیے گئے ہیں۔ ان ایجنسیوں کی یونیورسٹی میں اندراج کی مدت کار ۳۱ر اکتوبر کو مکمل ہوگئی۔ اس کے لیے یونیورسٹی نے نئی ایجنسیوں سے انسانی وسائل مہیا کرانے کے لیے ٹینڈر طلب کیے جس میں یقیناً بہت تاخیر ہوئی، شاید یونیورسٹی کے ذمہ داروں کو یہ اندازہ تھا کہ ٹینڈر میں پرانی ایجنسیاں واپس آجائیں گی اور کام پہلے کی طرح چلتا رہے گا، لیکن ٹینڈر جب کھلا تو ان میں سے ایک ایجنسی اوکاس سیکورٹی گارڈز کا نام ہوئی۔ اسی ایجنسی نے یونیورسٹی کو دفتری کاموں کے لیے اسٹینو گرافر، کلرک، کمپیوٹر آپریٹر، چپراسی وغیرہ کنٹریکٹ ملازمت پر مہیا کرائے تھے۔ جب ٹینڈر میں اس ایجنسی کو کامیابی نہیں ملی تو یونیورسٹی انتظامیہ نے تمام غیر تدریسی عملے کو کام کرنے سے منع کردیا بلکہ انھیں ایک طرح سے رخصت کردیا گیا۔ یہ چار درجن ملازمین اب کہاں جائیں یہ بتانے والا کوئی نہیں ہے۔ یونیورسٹی انتظامیہ اب اس بات کا انتظار کررہی ہے کہ جس نئی ایجنسی کو ٹینڈر ملا ہے وہ کب کنٹریکٹ ملازمین مہیا کرانے کے لیے انٹرویو کراتی ہے۔

اس سلسلے میں جب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر خان مسعود احمد سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے اپنے آپ کو علاحدہ کرلیا اور پوری ذمہ داری رجسٹرار پر ڈالتے ہوئے ملازمین کی فراہمی اور یونیورسٹی کے کاموں کی تکمیل کے لیے ان سے رابطہ کرنے کو کہا۔ مستقل ملازمین کی تقرری کے سلسلے میں پروفیسر خان نے کہا کہ ابھی اس کے لیے حکومت کی جانب سے منظوری نہیں ملی ہے، اس سلسلے میں خط و کتابت جاری ہے۔

رجسٹرار ہاشم حسین جعفری نے اس بات کو تسلیم کیا کہ ٹینڈر میں پرانی ایجنسی کو واپسی کا موقع نہیں ملا، جب کہ وہ دیگر ایجنسیاں نئے ٹینڈر حاصل کرنے میں کامیاب رہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ دونوں ایجنسیاں یونیورسٹی کو صفائی ملازمین اور سیکورٹی گارڈ مہیا کرائیں گی جب کہ دفتری کاموں کے لیے کنٹریکٹ ملازمین کی فراہمی نئی ایجنسی کرے گی۔ نئی ایجنسی کو جاب آرڈر دے دیا گیا ہے اور جلدی ملازمین مہیا کرانے کی ہدایت دی گئی ہے۔ مسٹر جعفری نے کہا کہ توقع ہے نئی ایجنسی جلد از جلد ملازمین کا انٹرویو وغیرہ مکمل کرکے ضرورت کے مطابق انسانی وسائل مہیا کرائے گی۔ ٹینڈر اور انٹرویو عمل میں تاخیر اور ٹینڈر کا عمل پہلے کرائے جانے کے سوال پر جعفری صاحب نے کہا کہ گزشتہ ماہ بہت تعطیل رہی جس کی وجہ سے بھی کام متاثر ہوا۔ سوال یہ ہے کہ جب تعطیل رہنے پر کام متاثر ہوسکتا ہے تو ملازمین نہ ہونے پر کام کیسے ہوگا؟ اس سوال کے جواب پر مسٹر جعفری نے کہا کہ کسی طرح سے کام چلایا جائے گا۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

ساحرؔ کی شاعری میں صدائے احتجاج

ڈاکٹر مسعود جعفری (5/8-1-43/1/A/5، پوسٹ آفس شیخ پیٹ، حیدرآباد - 500 008)

ساحر نے رومانس بھری شاعری کی۔ زلف و رخسار کی باتیں کیں۔ عارض و پیکر کے نغمے چھیڑے۔ ہجر جاناں میں اپنی شامیں اداس کیں۔ راتوں کو جام و سبو میں ڈبونے کی کوشش کی۔ صبحوں کو اشکوں سے دھونے کے لیے اپنے ہاتھ بڑھائے۔ بے خیالی میں گنگنانے لگے:

چند کلیاں نشاط کی چن کر
مدتوں محو یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

زندگی کے حسین سوز پہ معشوق کی محبت بھری قربتوں میں دریا کی موج کی طرح لہرانے لگتے ہیں۔ کیف و سرور کا عالم دیکھیے:

رواں ہے چھوٹی سی کشتی ہواؤں کے رخ پر
ندی کے ساز پہ ملاح گیت گاتا ہے
تمہارا جسم ہر اک لہر کے جھکولے سے
مری کھلی ہوئی بانہوں میں جھول جاتا ہے
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت کبھی یقین کی طرح

ساحر کا خوب صورت خواب تعبیر کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ اس کی محبت منزل پر پہنچ کر بھی پیاسی رہی۔ اسے خوشیاں راس نہیں آئیں۔ اس کی نس نس میں تلملاہٹ بھر گئی۔ وہ اپنے ٹوٹے ہوئے سپنے کی کرچیاں لیے سانس لیتا رہا۔ اس کا وجود آتش فشاں ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے گرم آنسو کے قطرے ٹپکنے لگے۔ وہ سراپا ایک احتجاج بن گیا۔ اس نے سماجی بندھنوں اور بوڑھی رسموں کو چیلنج کیا۔ وہ دنیا کے فرسودہ رسم و رواج سے بیزار ہو گیا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ پورا معاشرہ ایک تاریک زنداں بن گیا ہے۔ اس کی اونچی دیواریں اسے کاٹ کھا رہی تھیں۔ وہ پھیلتے ہوئے اندھیرے میں روشنی کا سراغ ڈھونڈ رہا تھا۔ اب وہ عشق و رومان کے آسمان سے حقیقت کی تپتی ہوئی زمین پر قدم رکھ چکا تھا۔ اس کا رویہ اور تیور تبدیل ہو چکے تھے۔ اس کی سوچ اور فکر میں تکمیل ہو گئی تھی۔ وہ پل پل بے چین اور مضطرب رہنے لگا تھا۔ خوابوں کا کال پڑ گیا تھا۔ اس نے سوچا نہیں تھا کہ اس کی شاعری میں آگ بھر جائے گی۔ اس کے سینے میں انقلابی لہریں مچلنے لگیں۔ وہ سماجی و سیاسی ناانصافیوں پر تڑپنے لگے۔ وہ انسانیت کے بہتے ہوئے لہو پر ملک و قوم کے رہنماؤں سے سوال کرنے لگے:

جمہور سے یوں دامن نہ چھڑا
اے رہبر ملک و قوم بتا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا

ساحر نے ان شعروں میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی کا حوالہ کہیں نہیں دیا۔ اس نے عوام یعنی جمہور کا لفظ استعمال کیا جس میں آفاقیت ہے۔ کسی خاص طبقے یا فرقے کی تخصیص نہیں ہے۔ اس کی آواز کی لے اونچی ہے۔ وہ رہبروں سے جواب مانگ رہا ہے۔ یہ بے باکانہ انداز بیان اسے اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے۔ وہ ان سے دو قدم آگے نکل جاتا ہے۔ اس کی عوامی مقبولیت بے انتہا ہو جاتی ہے۔ ساحر نے ہمیشہ وقت کے جبر و استبداد کے خلاف حق و صداقت کا پرچم اٹھایا۔ اپنے پیام سے لوگوں کے دلوں میں عزم و ولولہ پیدا کیا۔ انھیں عصری شعور سے بہرہ ور کیا۔ ساحر کا لب و لہجہ بنگال پر ترش ہو جاتا ہے۔ وہ غیظ و غضب کے عالم میں سوال کرنے لگتا ہے۔ پوری نظم ایک سوالنامہ ہے۔ شاعر کا مخاطب وہی سیاست داں ہے جو سارے فتنہ و فساد کی جڑ ہے۔ لفظیات کے اندر چھپی برق تپاں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی یہ نظم ایک احتجاج ہی نہیں ایک زبردست سماجی چیلنج ہے۔ جس سے ارباب اقتدار دہل اٹھے۔ اس نظم میں عوام کی زبوں حالی اور کس مپرسی کی بھرپور ترجمانی کی گئی ہے۔ نظم کے بند ملاحظہ کیجیے:

جہان کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانو
نظام نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں
یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان پہ دیس کی جنتا سسک سسک کے مرے
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اگلا تھا
کہ نسل آدم و حوا بلک بلک کے مرے

نظم کا اثر بند پر ختم ہوتی ہے اور دل و دماغ پر گہرا نقش مرتب کرتی ہے۔ قاری نظم کی فضا میں گم ہو جاتا ہے۔ اس طرح بنگال پر لکھی گئی نظم احتجاج کا منشور بن جاتی ہے۔ آخری بند دیکھیے:

پچاس لاکھ فسردہ گلے سڑے ڈھانچے
نظام زر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں
خموش ہونٹوں سے دم توڑتی نگاہوں سے
بشر بشر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

ساحر امن کے پیامبر تھے۔ انھوں نے ساری زندگی جنگ بازوں اور موت کے سوداگروں کی مذمت کی۔ اخوت و بھائی چارگی اور آشتی کا علم اٹھایا۔ ان کی وابستگی بنی نوع انسان سے تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کرۂ ارض پر تباہی و بربادی کا عفریت رقص کرے۔ انھوں نے دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریاں دیکھی تھیں اور وہ تیسری عالمگیر جنگ سے دنیا کو بچانا چاہتے تھے۔ انھوں نے امن عالم کے موضوع پر طویل نظم 'پرچھائیاں' لکھی اور تیسری جنگ عظیم کے ہولناک انجام سے دنیا کو آگاہ کیا۔ ساحر دونوں جنگوں کا تقابل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

ساحر کو خلوتوں اور جلوتوں کے دھواں دھواں ہو جانے کا اندیشہ تھا اور یہ بے بنیاد بھی نہیں تھا۔ نازی ازم اور فاشزم نے یورپ ہی نہیں ساری دنیا میں قیامت برپا کر دی تھی۔ بچے، بوڑھے، جوان نان شبینہ کے محتاج ہو گئے تھے۔ پہلی دفعہ جوہری بموں کا استعمال کیا گیا۔ ہیروشیما ناگاساکی کھنڈر میں تبدیل ہو گئے۔ افلاس، بھوک، بیماری انسان کا مقدر ہو گئے۔ ہر سمت واویلا مچ گیا۔ ایشیا بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ دانشور متفکر ہو گئے۔ وہ بڑھتی ہوئی نراجیت اور فسطائیت کے سیلاب کی روک تھام کے لیے آگے آنے لگے۔ ساحر نے بھی اپنے قلم کو حالات کی تبدیلی کا ذریعہ بنایا۔ انھوں نے اس نظم کو ماضی و حال سے مربوط کیا۔ ابتدا سے انتہا تک نظم کی تاثیر باقی رہتی ہے۔ جس سے شاعر کی فکری گہرائی و گیرائی کا پتا چلتا ہے۔

اس کامیاب نظم کے کئی ٹکڑے احساسات میں ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ ساحر نے اپنی شاعری کو لب لعلیں یا چشم نرگس تک محدود نہیں رکھا۔ انھوں نے اسے جور و ستم، استحصال، سرمایہ دارانہ چیرہ دستیوں اور بین الاقوامی سازشوں، سفاکیوں کے خلاف احتجاج کی لے بنایا۔ ساحر نے اردو شعر و ادب کو ثروت مند بنایا۔ اس کے کینوس کو وسیع تر کیا۔ انھوں نے ایسے نایاب و نادر موضوعات کا انتخاب کیا جو بیسویں صدی کی شاعری میں اضافہ کہلائے جا سکتے ہیں۔ اسی لیے ساحر کا شاعرانہ منصب سب سے جدا اور منفرد ہے۔ اس کی رومانی و احتجاجی شاعری دریا کے دو کنارے ہیں جو الگ ہوتے ہوئے بھی خوب صورت لگتے ہیں۔ ساحر کی شاعری پر وقت کی دھول نہیں جم سکتی۔ یقین ہے کہ آنے والی نسلیں اس کا کلام پڑھ کر جھومتی رہیں گی۔

●●●

ادارے کا مضمون نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے ___ (ادارہ)

Editor: Ather Farouqui | مدیر: اطہر فاروقی
Joint Editor: Mohd. Arif Khan | شریک مدیر: محمد عارف خاں
Printer, Publisher: Shahid Khan | پرنٹر پبلشر: شاہد خاں
مطبوعہ: ثمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
Printed at: Samar Offset Printing Press, Delhi
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲-راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
Proprietor: Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue, New Delhi-110002
قیمت (فی شمارہ): تین روپے، سالانہ: ۱۲۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Subscription: (Per Issue): Rs. 3/-, Yearly: 125/-
(Foreign Countries: US $ 8)
http//www.atuh.org. Phones: 23237212, 23237214